خواجہ میر درد

مولانا محمد حسین آزاد خواجہ میر درد کا ان بلند پایہ شاعروں میں شمار کرتے ہیں "جنھوں نے اُردو زبان کو خراد اتارا۔" جناب امیر مینائی جو خود ایک خوش گو شاعر اور سخن فہم ہیں خواجہ میر درد کے شعروں میں "بسی ہوئی بجلیوں" کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ اردو تذکرہ نگار اور نقاد ان کا نام ادب و احترام سے لیتے ہیں اور ان کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب شعرائے اردو کی محفل میں مختصر سا شعری سرمایہ لے کر داخل ہوئے مگر انھوں نے جو کچھ کہا سراسر انتخاب ہے اور رطب و یابس سے بالکل پاک!

خواجہ صاحب ایک درویش اور خدا رسیدہ بزرگ خواجہ محمد ناصر عندلیب کے نورِ نظر تھے۔ کچھ اپنی طبیعت کی افتاد اور کچھ اس مردِ درویش کی صحبت کا فیض کہ اٹھائیس برس کی عمر میں کاروبارِ دنیا سے منھ موڑ کے درویشی اختیار کر لی اور انتالیس برس کی عمر میں والد کی رحلت کے بعد مسند نشینِ ارشاد ہو گئے۔ شاعری پہلے بھی کرتے تھے گوشہ نشینی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا مگر اندازِ کلام یکسر بدل گیا۔ اب صوفیِ صافی تھے اور معشوقِ حقیقی کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر۔ شاعری میں بھی اس دائرے سے باہر قدم رکھنے کو ایک صوفی کی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کا بیشتر کلام ایک متصوفانہ رنگ میں رنگا ہوا ہے (کلامِ درد کے اسی رنگ کو دیکھ کر مولانا محمد حسین آزاد نے فرمایا کہ "تصوف جیسا انھوں نے کہا اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔" تاریخِ ادبِ اردو کے مولف جناب رام بابو سکسینہ نے یہاں تک لکھ دیا کہ "خواجہ میر درد کے ہر شعر میں معشوق سے مراد معشوقِ حقیقی یا مرشد ہے۔" اور ڈاکٹر اعجاز حسین نے یہ فیصلہ صادر فرما دیا کہ "ان کے یہاں عشقِ حقیقی کا جلوہ ایسا غالب ہے کہ مجازی عشق کو کہیں جگہ نہیں ملتی۔" لیکن دیوانِ درد کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے۔

لباسِ درویشی زیبِ تن کرنے سے پہلے خواجہ میر درد کچھ عرصے فوج میں ملازم رہ چکے تھے اور جیسا کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے لکھا ہے وہ ابتدائے شباب میں دنیادار بھی رہے، جاگیر کے انتظام اور معاش کے اہتمام میں تگ و دو بھی کی، شاہی امرا و مقربانِ بارگاہ کے ناز بھی اٹھائے، یہ کیسے ممکن ہے کہ شاعرانہ مزاج، گداختہ دل اور جمالیاتی ذوق رکھنے والے اس نوجوان کے دل کا ورق اٹھائیس برس کی عمر تک بالکل سادہ رہا ہو؟ کہا گیا ہے کہ عشقِ مجازی عشقِ حقیقی کا زینہ ہے۔ جسے خدا کے بندوں سے پیار کرنا نہ آتا ہو وہ خدا سے کیسے عشق کر سکتا ہے؟ درد کے بہت سے شعر ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے کسی مٹی کی مورت کو چاہا تھا اور جی جان سے چاہا تھا۔

شاعری میں تخیل کی کارفرمائی سے انکار ممکن نہیں۔ درد کی شاعری میں جس مجازی محبوب کی پرچھائیاں جا بجا نظر آتی ہیں ہو سکتا ہے اس کا وجود محض فرضی ہو لیکن اس کا امکان بھی کچھ کم نہیں کہ انھوں نے سچ مچ کے کسی حسین کو چاہا ہو، اس کے ناز اٹھائے ہوں، اس کی پرستش کی ہو۔ درد کے شعروں میں محبوب کے وعدوں اور وعدہ خلافیوں، وفاؤں اور بے وفائیوں، اس کے بننے اور سنورنے، روٹھنے اور منانے اور اپنے دل کی بے کلی کا جو ذکر ملتا ہے، اس کی تہ میں کوئی صداقت نظر آتی ہے۔ کیا عجب انھوں نے سچ ہی کہا ہو کہ ——

تمھارے وعدے بتاں خوب میں سمجھتا ہوں — رہا ہے ایسے ہی لوگوں سے کاروبار مجھے

اب درد کے کچھ ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جن پر مجاز کے سوا کوئی اور لیبل لگانا سراسر ناانصافی ہے ——

یوں وعدے ترے دل کو تسلی نہیں دیتے — تسکین تبھی ہووے گی جب آن ملے گا

کہیں ہوئے ہیں سوال و جواب آنکھوں میں — یہ بے سبب نہیں ہم سے حجاب آنکھوں میں

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی — ایک بھی اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

کیا جگر کو مرے داغ تیرے وعدوں نے — خبر سنی جو کہیں میں کسو کے آنے کی

سناؤں کیونکر اپنا حال میں کیا سخت مشکل ہے — یہ قصہ جب لگوں کہنے تو اس کو نیند آتی ہے

مدت ہوئی کہ ویسی عنایات رہ گئی — اب گاہ گاہ سیدھی ملاقات رہ گئی

دل تجھے کیوں ہے بے کلی ایسی — کون دیکھی ہے اچپلی ایسی

تو بن کہے گھر سے کل گیا تھا — اپنا بھی تو جی نکل گیا تھا

Scanned by TapScanner

اب دل کو سنبھالنا ہے مشکل — اگلے دنوں کچھ سنبھل گیا تھا

دل بھلا ایسے کو اے درد نہ دیجے کیونکر — ایک تو یار ہے اور اس پہ طرحدار بھی ہے

درد کے عشق مجازی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ محبوب کا سراپا بھی بیان کرتے ہیں، اس کے ہرجائی پن کا پردہ بھی چاک کرتے ہیں، اس کی تلوّن مزاجیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں مگر متانت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ رکاکت و ابتذال کا تو ذکر ہی کیا، ان کے منہ سے کبھی کوئی ہلکی بات نہیں نکلتی۔ وصال کا ذکر بھی کرتے ہیں تو ضبط و اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ ان کے عشقیہ اشعار میں ایسی پاکیزگی اور ایسی لطافت ملتی ہے جو اردو کے کم شاعروں کو نصیب ہے۔ ثبوت کے لیے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

یوں تو ہے دن رات میرے دل میں اس کا ہی خیال — جن دنوں اپنی بغل میں تھا سو وہ راتیں کہاں

کون سی رات آن ملیے گا — دن بہت انتظار میں گزرے

دن تمھارے تو کٹے بارے خوشی سے ہر طرح — ہم بلا سے یاں پڑے راتوں کو گھبرایا کیے

شام بھی ہو چکی کہیں اب تو — آخشتابی کہ رات جاتی ہے

درد کے کہنے کو اے یار بُرا کیوں مانا — اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

ہر چند نہیں صبر تجھے درد و لیکن — اتنا بھی نہ ملیو کہ وہ بدنام کہیں ہو

ظالم جفا جو چاہے سو کر مجھ پہ تو ولے — پچھتاوے پھر تو آپ ہی ایسا نہ کر کہیں

درد کی عشقیہ شاعری کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں ــــ

"خواجہ میر درد کی شاعری کا عاشق اپنے مزاج کے اعتبار سے میر کی شاعری کے عاشق سے بہت ملتا جلتا ہے۔ دونوں کے یہاں دھما چوکڑی اور کشتم کُشتا کے بجائے سپردگی اور گداختگی ملتی ہے۔ دونوں آہستہ آہستہ سلگتے ہیں۔ یکایک بھڑک نہیں اٹھتے۔ دونوں محبوب کی بے وفائیوں سے پیار کرتے ہیں۔ ایک مدت تک اپنے دل کو بہلاتے پھسلاتے رہتے ہیں۔ تغافل کا جواز بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں، محبوب سے شکوہ شکایت کرنے میں ڈانٹتے پھٹکارتے نہیں، دھمکی یا چیلنج نہیں دیتے، نرم اور مانوس لہجے میں کچھ سرگوشی اور چمکارنے کے انداز میں باتیں کرتے ہیں۔"

تقریباً یہی بات مولانا محمد حسین نے آب حیات میں کہی ہے۔ فرماتے ہیں "انھوں نے میر کی غزلوں پر جو غزلیں

لکھی ہیں وہ میر سے کسی طرح کم نہیں۔" اعظمی صاحب نے اپنے دعوے کی دلیل میں بہت سے اشعار پیش کیے ہیں جن میں سے اکثر اوپر گزرے۔ دو مزید اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں ــــ

جس دل پہ بے وفائیِ معشوق کے سبب — یہ کچھ گزر چکا ہو وہ پھر چاہ کیا کرے

دل دے چکا ہوں اس بُتِ کافر کے ہاتھ میں — اب میرے حق میں دیکھیے اللہ کیا کرے

اُس بت کافر کو دل دینے کا نتیجہ آخرکار ان کے حق میں یہ نکلا کہ انھیں اپنے اللہ تک پہنچنے کا راستہ مل گیا جبھی تو عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کا زینہ کہا گیا ہے۔

تسلیم کرنا چاہیے کہ درد کا اصل رنگ وہ ہے جو ان کے متصوفانہ کلام میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کلام بلاشبہ خواجہ میر درد کی زندگی کا آئینہ ہے۔ کاروبارِ دنیا سے تعلق منقطع کر لینے کے بعد وہ گوشہ نشین ہو گئے اور قناعت کی زندگی گزارنے لگے۔ اب انھوں نے اپنی شاعری کو درسِ اخلاق اور تصوف کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا۔

تصوف کس لفظ سے نکلا اور اس کے کیا معنی ہیں اس کے بارے میں اتنا کچھ کہا گیا ہے کہ اس کا یہاں دہرانا ممکن نہیں۔ بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ تصوف سے مراد ہے خود کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے وقف کر دینا۔ بیشتر صوفیا کا عقیدہ یہ رہا ہے کہ ساری کائنات خدا کے نور سے بنی ہے اور اسی کی ذات کا ایک جزو ہے۔ گویا ہمہ اوست یعنی سب کچھ خدا ہی ہے۔ یہ فلسفہ وحدت الوجود کے نام سے مشہور ہوا۔ اس فلسفے کی سب سے زیادہ وکالت شیخ محی الدین ابن عربی نے کی۔ اس پر ویدانت اور افلاطونی فلسفے کا بھی اثر ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ ساری کائنات خدا کے نور سے نہیں بلکہ اس کے حکم سے بنی ہے۔ اس لیے اس کا جزو نہیں ہو سکتی۔ ہمہ از وست یعنی سب کچھ اس کے اشارے پر ہوا۔ یہ فلسفہ وحدت الشہود کہلاتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی اس فلسفے کے علمبردار ہیں۔

خواجہ میر درد فلسفۂ وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ ان کے کلام میں اس مضمون کے اشعار بہت نظر آتے ہیں کہ دنیا میں اے خدا تیرا ہی جلوہ نظر آتا ہے یا میرے دل میں تیرے سوا اور کسی کی یاد نہیں۔ وحدت الوجود کی انتہا یہ ہے کہ بندے کو خود اپنی ذات میں معبودِ حقیقی کی پرچھائیں نظر آئے۔ درد کے یہاں اس مضمون کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں ــــ

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

Scanned by TapScanner

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے — میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا — برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

جمالِ رخِ یار تھے آپ ہی ہم — کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

تصوف سے وسیع القلبی کی تعلیم ملتی ہے۔ صوفیا کا مسلک یہ رہا ہے کہ انسان کسی بھی مذہب کا پیرو ہو اور کسی بھی مسلک سے تعلق رکھتا ہو اگر وہ اپنے پیدا کرنے والے پر یقین رکھتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے تو وہ لائقِ احترام ہے۔ مذہب یا طریقِ عبادت کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا ـــــ انسانیت ہی اصل چیز ہے۔

بستے ہیں ترے سائے میں سب شیخ و برہمن — آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا

کعبے کو بھی نہ جائیے دیر کو بھی نہ کیجو منہ — دل میں کسو کے درد یاں ہووے تو راہ کیجیے

عشقِ الٰہی کا نام ہی تصوف ہے۔ بندے کو خدا سے عشق ہوتا ہے اور وہ وصل کا طلبگار ہوتا ہے۔ یہ مرتبہ تو کم ہی حاصل ہوتا ہے کہ انسان مجذوب ہو جائے یعنی خدا کی ذات میں جذب ہو جائے۔ وہ ساری زندگی محبوبِ حقیقی کے فراق میں تڑپتا رہتا ہے۔ اس سے شاعر کے کلام پر حزنیہ فضا چھا جاتی ہے۔ صوفی کو یوں بھی دنیا حقیر اور زندگی حد سے زیادہ ناپائدار نظر آتی ہے۔ درد فرماتے ہیں ـــ

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

پانی پر نقش کب ہے ایسا — جیسے ناپائدار ہیں ہم

درد کے کلام میں پند و نصائح کے مضمون جا بجا نظر آتے ہیں۔

اگر جمعیتِ دل ہے تجھے منظور قانع ہو — کہ اہلِ حرص کے کب کام خاطر خواہ ہوتے ہیں

کلامِ درد کے سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ یہاں جمالیاتی عنصر کی فراوانی ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ الفاظ کے انتخاب اور الفاظ کی ترتیب کا وہ بطور خاص خیال رکھتے ہیں۔ اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ہر شعر سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ دیکھیے ـــــ

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا — بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری — جی میں یہ کس کا تصور آ گیا

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

درد تشبیہ و استعارے کا استعمال ایسی ہنرمندی کے ساتھ کرتے ہیں کہ ایک جیتی جاگتی تصویر پیشِ نظر ہو جاتی ہے۔ گویا پیکر تراشی سے وہ خاص طور پر کام لیتے ہیں۔ اس کی چند مثالیں پیش ہیں ـــــ

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

شمع کی مانند ہم اس بزم میں — چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

ہم گلشنِ دوراں میں اے خانگیِ طالع — سرسبز تو ہیں لیکن جوں سبزۂ بیگانہ

کلامِ درد میں ابہام کی دلکش مثالیں بھی موجود ہیں۔ دیکھیے ـــــ

کھل نہیں سکتی ہیں اب آنکھیں مری — جی میں یہ کس کا تصور آ گیا

نہ سمجھا درد ہم نے بھیدیاں کی شادی و غم کا — سحر خنداں ہے کیوں روتی ہے کس کو یاد کر شبنم

تہمتِ چند اپنے ذمے دھر چلے — کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے

بلندیِ تخیل سے بھی شعر کا رتبہ بلند ہوتا ہے۔ درد کے اشعار میں یہ صفت بھی موجود ہے۔ انسان زور سے اور لگاتار ہنسے تو آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے۔ شاعر کا تخیل اس پانی کو آنسوؤں کی شکل میں دیکھتا ہے۔ کہتے ہیں ـــــ

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا — کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا

پھول کے کھلنے میں شاعر اس کے شگفتگی اور اس کی شکستگی دونوں کی تصویر ایک ساتھ دیکھتا ہے۔

شادی کی اور غم کی ہے دنیا میں ایک شکل — گل کو شگفتہ دل کہو تم یا شکستہ دل

غرض درد نے زیادہ سے زیادہ شعری وسائل کا استعمال کر کے اپنی غزل کو ایسی آب و تاب بخشی کہ ان کا ہر شعر انتخاب معلوم ہوتا ہے۔ ✻ ✻

Scanned by TapScanner

غلام ہمدانی مصحفی

اردو شعرا میں مصحفی ایک بلند مرتبے پر فائز ہیں مگر ان کی اتنی قدر نہیں ہوئی جتنی قدر کے وہ مستحق تھے۔ فارسی، عربی شاعری، نثری رسالوں اور شعرا کے تین تذکروں کے علاوہ ایک دیوان قصائد اور نو دو اوین غزلیات ان سے یادگار ہیں جو ایک مدت تک طباعت سے محروم رہے۔ نتیجہ یہ کہ ناقدین و قارئین کی ان کے پورے کلام تک رسائی نہ ہو سکی اور ہو بھی جاتی تو اس انبار میں سے اچھے اشعار ڈھونڈ نکالنا کس کے بس کی بات تھی۔ مصحفی زود گو بھی تھے اور پُرگو بھی۔ وہ بہت زیادہ کہتے تھے اور بہت جلد کہتے تھے۔ ایسے میں یہ فرصت کہاں تھی کہ جو شعر ایک بار کہہ دیا اسے مکرر دیکھیں اور سنواریں۔ ستم یہ کہ اپنی اس عادت پر فخر بھی کرتے تھے ان کا ایک فارسی شعر ہے ___

آں فرصتم کجاست کہ اے مصحفی دگر　　بینم بہ چشمِ خویش غزلہائے گفتہ را

اس عادت نے انھیں بہت نقصان پہنچایا۔ جو تھوڑے سے شعر عام طور پر دستیاب تھے ان کی روشنی میں ناقدین سرسری رائیں دیتے رہے اور غلط فیصلے کرتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ ناانصافی محمد حسین آزاد نے کی۔ انھیں مصحفی کے کلام میں "امروہہ پن" نظر آیا۔ لکھتے ہیں جہاں قدما کی زبان اور محاورے کی پیروی کی ہے وہاں کامیاب ہیں، جہاں امروہہ کے محاورے استعمال کیے ہیں وہاں ناکام اور مثال میں جو محاورے پیش کیے ہیں وہ میر کے دیوان میں بھی موجود ہیں۔ موضوعات کے بارے میں یہ رائے ہے کہ شعرائے متقدمین کے مضامین کو لفظی ہیر پھیر کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ طنزیہ لہجے میں فرماتے ہیں "الفاظ کو پس وپیش اور مضامین کو کم وبیش کر کے استادی کا جو حق ہے ادا کر دیا ہے۔" یہ الزام بھی سراسر غلط ہے۔ مصحفی تنقید نگار و تذکرہ نویس بھی تھے۔ انھوں نے اپنے شعری سرمایے کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ اساتذہ کے کلام سے فیض بھی اٹھایا مگر ان کا اپنا رنگ ہے اور ان کا انداز جداگانہ ہے۔

مصحفی کے مخصوص انداز پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں کہ اردو شاعری میں مصحفی کا ایک خاص مقام ہے۔ اردو غزل کے ارتقا میں ان کا کلام ایک اہم منزل کا حکم رکھتا ہے۔ ہمہ رنگی کے باوجود ان کا اپنا بھی ایک رنگ ہے اور یہی وہ رنگ ہے جس نے مصحفی کو مصحفی بنایا اور اب تک ان کے نام اور کام کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ روشن اور درخشاں رکھا اور ہمیشہ ہمیشہ روشن اور درخشاں رکھے گا۔ یہ رنگ وہ رنگ ہے جو دوسروں کے ساتھ ان کی جزوی مماثلتوں میں اتنا نہیں چمکتا جتنا ان کے اپنے انفرادی نقوش میں کھلتا ہے ___ اور یہ انفرادی نقوش وہ ہیں جو ان سے پہلے کسی شاعر کے کلام میں اتنی آب و تاب سے نمایاں نہیں ہوئے جتنے مصحفی کے کلام میں نمایاں ہوئے ہیں ___ اور ان کے بعد بھی اگر کسی شاعر کے کلام میں ابھرے ہیں تو اس کی تنہا مثال شاید مولانا حسرت موہانی کی غزل میں ملتی ہے۔

جو حقیقت نظروں سے اوجھل رہی وہ یہ ہے کہ لکھنؤ اسکول کی صحت مند روایت کے بانی مصحفی ہیں۔ فحاشی اور جنس پرستی اس اسکول کو جرأت کی دین ہیں۔ لکھنؤ کے پُرامن ماحول اور آسودہ حالی نے اردو شاعری کو نشاطیہ عنصر عطا کیا۔ اس نشاطیہ عنصر کے بھی دو روپ ہیں۔ ایک تو رنگ رلیاں اور چھچھورپن جس سے مصحفی نے خود کو دور رکھا۔ دوسرے زندگی کا رجائی تصور یعنی یہ اعتماد کہ خوشی کے لمحے ضرور میسر آئیں گے اور دیرپا ثابت ہوں گے۔ یہ پُر امید رویہ اردو شاعری میں مصحفی کے ذریعے داخل ہوا۔ ان کا ایک شعر ہے ___

چلے بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم!　　کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

کیسی کامیاب مصوری ہے! اب غور کیجیے کہا کیا ہے: بہار کا قافلہ بڑا صبا رفتار ہے۔ ایک پل کو نہیں ٹھہرتا یعنی بہار آتے ہی گزر جاتی ہے اور بہار علامت ہے خوشی کی۔ نسیم جس کا کام ہی حرکت میں رہنا ہے بہار کا پیچھا کرتی ہے مگر اس سے پہلے کہ نسیم اسے اپنی گرفت میں لے لے بہار آگے بڑھ جاتی ہے۔ نسیم استعارہ ہے انسانی خواہش کا جو خوشیوں (بہار) کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی آرزومند ہے۔ جرسِ غنچہ کی صدا کلی کے چٹکنے کی آواز ہے۔ ادھر یہ صدا بلند ہوئی ادھر بہار کا کارواں روانہ ہوا۔ شاعر کہتا ہے، اے نسیم! ہمت نہ ہار جرسِ غنچہ کی صدا کو راہبر مان کر چلتی رہ چلتی رہ ___ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب تو بہار سے ہم آغوش ہوگی۔ کیسا امید افزا پیغام ہے اور کتنی پیچیدہ رعایتوں کے ساتھ ادا ہوا ہے! نسیم، جرسِ غنچہ کی صدا، قافلۂ نوبہار ___ کیسا زبان کا سنگھار ہے۔ کتنے استعاروں سے کام لیا گیا ہے۔ زبان

کی یہ رنگینی ورعنائی، یہ طرزِ ادا، یہ خوش لہجگی، یہ شیریں الفاظ وتراکیب کا استعمال اردو شاعری کو مصحفی کی عطائے خاص ہے۔

مصحفی کو دل کش، خوش آہنگ لفظوں اور ترکیبوں کو چننے اور انھیں صحیح جگہ پر جمانے کا کام اس ہنرمندی سے کرتے ہیں جیسے جوہری موتیوں کی لڑی تیار کرتا ہے۔ حسن پرستی اور نفاست پسندی مصحفی کا مزاج ہے۔ انھیں اس کا بہت خیال رہتا ہے کہ شعروں سے ایک لطیف دھن پیدا ہو۔ گویا غنائیت ان کے کلام کا نمایاں وصف ہے۔ عموماً وہ بحریں بھی ایسی انتخاب کرتے ہیں جن میں موسیقیت ہو۔ ردیف وقافیہ کے انتخاب میں بھی وہ بہت محتاط ہیں۔ یہ اور بات کہ لکھنؤ کا ماحول استادانہ مہارت کا مطالبہ کرتا تھا۔ لمبی کڈھب ردیفوں اور سنگلاخ قافیوں کی کسوٹی پر قادرالکلامی کی سند دیتا تھا۔

مصحفی کی غزل کا تجزیہ کیا جائے تو ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے۔ وہ شدید کیفیتوں کے بجائے نرم کیفیتوں کے شاعر ہیں۔ وہ تیز روشنی پر دھندلکے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں تصویریں جابجا نظر آتی ہیں۔ ان میں روشن تصویریں کم ہیں اور وہ تصویریں زیادہ جن پر دھند سی چھائی ہوئی ہے۔ کہر آلود کیفیتیں زیادہ دلکش ہوتی ہیں اور انھوں نے مصحفی کے شعروں کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔

ان کی ترکیبیں خاص طور پر بہت مترنم ہوتی ہیں جیسے: جرسِ غنچہ، قافلۂ نوبہار، برگِ گل وریحاں، غم زدۂ بے سروساماں، تازہ نہالانِ چمن، جامۂ گل دوز، اشکِ سرمژگاں، حسرت کشِ نظارہ، پیچ وتابِ کمروزلف، دامنِ صحرا، غبار آلودہ، پابہ زنجیر، نسیم سحری۔

آیئے اب یہ کیفیت ان کے شعروں میں ملاحظہ کیجیے ــــــ

کھول دیتا ہے تو جب جا کے چمن میں زلفیں
پابہ زنجیر نسیمِ سحری نکلے ہے

کیا نظر پڑ گئیں وہ چشمِ خمار آلودہ
شفقِ صبح تو ہے زورِ بہار آلودہ

جب واقفِ راہ وروشِ ناز ہوئے تم
عالم کے میاں خانہ برانداز ہوئے تم

نسبت تمھیں کیا تازہ نہالانِ چمن سے
اب نامِ خدا سروِ سرافراز ہوئے تم

رہنے دو پڑا مصحفیِ خاک بسر کو
اس غم زدۂ بے سروساماں کو نہ چھیڑو

میں اس قد وعارض کو کریاد بہت رویا
مذکور گلستاں میں کچھ سرو سمن کا تھا

"وہ دھیمے، مبہم اور مدھم نقوش وتصورات کے شاعر تھے۔ ان کا ذہن شوخ، شدید اور پُرجوش حالتوں اور کیفیتوں کا دلدادہ نہیں۔ ان کی شاعری کی معنوی فضا خواب آلودہ سی ہے۔ چاندنی راتوں کی نہار آلود فضا جس کی دھندلاہٹ ہی اس کے حسن وجمال کا اصل ذریعہ ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری کے علامات ورموز اور استعارے اور تشبیہیں اور ان کی دنیائے عشق کے خاص کارندے اور کردار بھی سبک رفتار اور نرم ونازک اور لطیف ہیں۔"

آخر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ دہلی میں ان کی عمر گزری تھی اور دبستانِ دہلی کے اثر سے ان کے یہاں داخلی شاعری کی مثالیں کچھ کم نہیں جیسے:

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

مگر لکھنؤ کے ماحول نے ان کی شاعری میں خارجیت کو داخل کیا مگر یہ خارجیت ہلکی سی داخلیت لیے ہوئے ہے اور یہی مصحفی کا خاص رنگ ہے۔ گویا ان کے یہاں تڑپا دینے والی کیفیتوں سے زیادہ دل کو ٹھنڈک پہنچانے والی کیفیتیں ہیں۔ شدت کے بجائے نرمی اور حلاوت ہے، مایوسی کے بجائے امید اور حوصلہ مندی ہے اور وہ اردو زبان کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے الفاظ وتراکیب کے انتخاب میں بیحد نفاست پسندی کا ثبوت دیا غالباً سودا سے بھی زیادہ۔ ان کی آواز سب سے الگ، سب سے نمایاں اور دل فریب ہے۔

* *

Scanned by TapScanner